باب اوّل

اسلام کی تاریخ میں
''عقل اور نقل'' کی کشمکش
کے دو اہم دور
اور برصغیر میں علی گڑھ اور دیوبند کے دو متضاد مکاتب فکر کا قیام

(تذکرہ وتبصرہ......''میثاق'' لاہور، اکتوبر ۶۸ء)

اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کا نزاع تقریباً ابتداء ہی سے چلا آ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ''مذہب'' اپنی اصل کے اعتبار سے ''نقل'' ہے جو اولاً فرشتے کی وساطت سے خدا سے پیغمبر ﷺ کو منتقل ہوا اور پھر ان کی ذات گرامی ﷺ سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے لہٰذا اس کی اساس ''نقل'' پر ہے نہ کہ ''عقل'' پر......لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب انسان ہیں جو چاہے تمام کے تمام ''ذوی العقول'' نہ ہوں، لیکن پیروی چونکہ وہ اپنی اسی اقلیت[1] کی کرتے ہیں جو ''ذی العقل'' ہوتی ہی، لہٰذا انسان پر بحیثیت مجموعی حیوان عاقل کا اطلاق غلط نہیں ہے۔ بنا بریں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ بالکل ابتداء ہی سے مذہب کے ''نقل'' کو ''عقل'' پر پرکھنے اور اس کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوشش ہوتی چلی آئی ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہر دور کی عقلی وفکری سطح کے مطابق علم کلام کا ذخیرہ تیار ہوتا رہا ہے۔

[1] Intellectual Minority

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں نبی اکرم ﷺ کی براہِ راست صحبت کی بدولت جو ایمان حاصل ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے اور کسی غیر صحابی کے ایمان کو اس پر قیاس کرنا مع الفارق ہے۔ انہیں علیم الیقین ہی نہیں حق الیقین کی جو کیفیت حاصل تھی اس میں استدلال کا عنصر اوّل تو تھا ہی بہت کم، اور جتنا تھا اس کی اساس بھی فطرت کے نہایت محکم لیکن سادہ دلائل پر تھی نہ کہ کسی پیچ در پیچ منطقیانہ قیل وقال پر۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر مبہم طریق پر واضح کر دی گئی ہے کہ امت کے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کے ایمان کو نہیں پہنچ سکتا۔ اُن کے قلوب جس نورِ ایمان سے منور تھے اور ان کے سینے جس حرارتِ ایمانی سے معمور تھے ان کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کا ''دل روشن'' اور ''نفس گرم'' نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایمان نے ایک ایسے بے تابانہ جذبے اور والہانہ عشق کی صورت اختیار کر لی تھی جو ہر دم عمل کی بھٹیوں اور آزمائشوں اور ابتلاؤں کے الاؤں میں کودنے کو اس طرح آمادہ وتیار رہتا ہے کہ عقل بے چاری کے لیے ''محو تماشائے لب بام'' رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔[1]

[1] بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی (اقبال)

اسی کی ایک ادنیٰ مثال ہے حضرت خالدؓ کا وہ قول جو انہوں نے غیر مسلم افواج سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ''لوگو! تمہارا سابقہ اس قوم سے ہے جو موت کو اسی قدر عزیز جانتی ہے جس قدر تم زندگی کو!''

دورِ صحابہؓ کے اختتام کے ساتھ ہی فطری طور پر ایمان کی ان کیفیات میں انحطاط واضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا اور ''عشق کی آگ''[2] ٹھنڈی پڑنی ہو گئی۔ نتیجتاً فوراً عقل کے قیل وقال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں ''عقل'' پر کئی دور آئے اور ہر دور میں اس کے صغریٰ وکبریٰ بدلتے رہے، لیکن مذہب کے

’’نقل‘‘ کے ساتھ اس کا تصادم مسلسل جاری رہا، اور یہ پینترے بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوتی رہی۔ دوسرے طرف سے حامیان و حاملانِ نقل اس کی جانب سے مدافعت کرتے رہے اوراس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں عقل اورنقل کے باہمی نزاع کا سلسلہ چلتا رہا۔

۲ؔ بجھی عشق کی آگ اندھیرا ہے! مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے! (ایضاً)

یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مذہب کے نقل کی کامل عقلی توجیہہ نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی۔اِاس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی نہایت محدود ہے اور زمان ومکان اورظروف واحوال کے بہت سے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے، جبکہ دین و مذہب کی اساس جن وراء الوراء حقائق پر ہے وہ غیر محدود بھی ہیں اورنہایت لطیف بھی......شریعت کے اوامرونواہی کے اسرار وحکم کا معاملہ دوسرا ہے۔اس میدان میں عقل اپنی جولانیاں جتنی چاہے دکھالے، ایمانیات واعتقادات کی سرحد شروع ہوتے ہی معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

اؔ یہ وہ ’’محالِ عقلی‘‘ ہے جس کا منطقی امکان اگر کوئی ہے تو صرف اُس وقت جب علم انسانی ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے لیے حقیقتِ نفس الامری بالکل کھل جائے اورحقائق اشیاء بالکل ’’کماہی‘‘ روشن ہوجائیں......اورظاہر ہے کہ یہ صرف آخرت میں ہوسکے گا!!

واقعہ یہ ہے کہ ایمان جن غیر محدود، لطیف اور وراء الوراء حقائق کے مجموعے کا نام ہے اُن کا مجرد نطق انسانی کی گرفت میں آنا بھی نہایت مشکل بلکہ تقریباً ممکن ہے، (تبھی تو اس مقام پر خود آسمانی کتابوں کو بھی اشاروں، کنایوں، استعاروں اورتمثیلوں پر اکتفا کرنی پڑتی ہے)......کجا یہ کہ انہیں ہر دور کی عقلی سطح پر وقت کے فلسفہ ومنطق کے غایت درجہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے!!

چنانچہ...... یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عقائد اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششوں سے بعض اوقات شدید نقصان بھی پہنچا۔ وقت کے فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھنے میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض حقیقی اجزاء کو کھوٹا بھی سمجھ لیا گیا اور وقت کی منطق کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض پہلو مجروح بھی ہوئے...... اس کے مقابلے میں ’’محفوظ‘‘ راستہ ہمیشہ ان ہی کا رہا جنہوں نے محض نقل پر اکتفا کی۔ اسی کو سینے سے لگائے رکھا، اسی کے تحفظ میں زندگیاں کھپا دیں اوراسے جوں کا توں اگلی نسل تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے...... بایں ہمہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا چونکہ مذہب کے نقل کی عقلی توجیہہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے، لہٰذا ہر دور میں دین و مذہب کے مخلصین اس کے لیے کوشاں رہے اورخود اپنے دین وایمان خے لیے خطرات مول لے کر بھی اس خطرناک مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایسے لوگوں کی ان تمام کوششوں کا اصل محرک نصح ونصرتِ دین ہی کا جذبہ تھا۔ان کے بارے میں یہ گمان کہ وہ دین ومذہب کے دشمن تھے یاان کا مقصد ہی اسلام کوگزند پہنچانا تھاایک شدید قسم کی زیادتی اورناانصافی ہے!

اصحابِ نقل کی جانب سے فطری طور پر ہر دور میں اصحاب عقل پرنکیر بھی ہوتی رہی۔لیکن اس کی بھی ہمیشہ دوسطحیں رہیں: ایک عومی سطح جس پر مجرد ردوانکار اوراصحابِ عقل کی موشگافیوں سے بیزاریٔ محض کا اظہار ہوتا رہا۔اور دوسرے علمی سطح پر، ایسے لوگوں کے ذریعے جنہوں نے اپنے دور کے فلسفہ ومنطق، علوم وفنون اورافکار ونظریات کے چشموں سے پوری طرح سیراب ہوکر اوراس طرح وقت کے عقلی معیار پر کاملاً پورے اتر کر......اور پھر خود ذہنی وعقلی اورقلبی وروحانی ہر اعتبار سے مذہب کا اصل دفاع ہر دور میں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔اس لیے کہ لوہا لوہے ہی سے کاٹا جاسکتا ہے اورعقل کا توڑ عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے!

دورِاوّل

اسلام کی تاریخ میں ’’عقل‘‘ اور ’’نقل‘‘ کا پہلا نزاع اُس وقت برپا ہوا جب اسلام کے اصحاب عقل نے یونان کے فلسفے اورارسطو کی منطق کے زیر اثر اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششیں شروع کیں اوراس کے نتیجے میں اسلام کے اساسی ایمانیات واعتقادات کے ضمن میں منطقی موشگافیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ عقل ونقل کی وہ جنگ شروع ہو گئی جس کا آغاز تو اگرچہ دورِ اُموی کے آخری زمانے میں ہوگیا تھا،لیکن جو اپنے پورے شباب کے دورِ عباسی میں پہنچی۔اس جنگ میں اوّل اوّل دو بالکل انتہائی نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کی کامل ضد تھے۔

چنانچہ ’’عقل خالص‘‘ نے معتزلہ کا روپ دھارا اور ’’نقل محض‘‘ نے اصحاب ظاہر کی صورت اختیار کی، لیکن رفتہ رفتہ اس ’’آویزش‘‘ میں ’’آمیزش‘‘ کا رنگ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معتدل نظام ہائے اعتقادی وجود میں آئے اوراشعری وماتریدی عقائد باقاعدہ مرتب ومدوّن ہوئے اورعوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے گوشۂ عافیت میں پناہ لی۔ خالص علمی سطح پر یہ نزاع بعد میں بھی جاری رہا اورامام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اورامام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ایسے اصحابِ فکر ونظر عقلیت پرستی پر شدید ’’عقلی‘‘ ضربیں لگا کر ’’نقل‘‘ کے دفاع کا مؤثر بندوبست کرتے رہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ معتزلہ اور اصحابِ ظاہر کے تصادم کے نتیجے میں جو معتدل ''مسلکِ اہل سنت'' اشاعرہ اور ماتریدیہ کہ نظام ہائے اعتقادی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس کا اصل تانا بانا بھی وقت کے فلسفہ و منطق ہی سے تیار ہوا ہے جس میں ایمان کے لازوال اور ابدی حقائق خوبصورتی کے ساتھ بُن دیئے گئے ہیں۔ گویا کہ اسے عقل اور نقل کا ایک حسین امتزاج تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ان تصریحات کے ساتھ کہ ایک تو اس میں اس قے حقیقت کو جو لازوال ولا فانی اور ازلی و ابدی ہے، عقل و منطق کے ان پیمانوں میں پیش کیا گیا ہے جو بالکل عارضی اور وقتی ہیں، دائمی و مستقل نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ان عقائد کے منطقی و کلامی طرز بیان میں ''حقیقتِ ایمان'' بتام و کمال سمودی گئی ہے۔

ان عقائد کو بھی زاد یادہ سے زیادہ ایک خاص دور کی عقلی سطح پر اور اس وقت کی متداول منطقی اصطلاحات میں ''حقائق ایمان'' کی امکانی حد تک ترجمانی قرار دیا جا سکتا ہے اور بس!

دوسرے یہ کہ اُس وقت بھی مذہب کا دفاع اور عقل و نقل کا یہ امتزاج صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا جو بیک وقت صاحبِ عقل بھی تھے اور حاملِ نقل بھی۔ بالکل ایک رخے لوگ اس کام کے لیے اس وقت بھی بے کار تھے۔ چنانچہ ''تہافت الفلاسفہ'' کے مصنفؒ [1] خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے، اور ''الردعلی المنطقیین'' کے مؤلفؒ [2] خود ایک بہت بڑے منطقی تھے۔ کسی ایسے شخص کے لیے جو خود وقت کے فلسفہ و منطق کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی گمراہی و کج فہمی کی جڑوں پر مؤثر تیشہ چلا سکے۔

1 امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

2 امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

دورِ ثانی

اسلام پر عقلیت کا دوسرا بڑا حملہ آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ کے اُس فلسفہ و فکر کے زیر اثر شروع ہوا جس کی تعمیر خالص مادہ پرستی کی اساس پر ہوئی تھی۔ برصغیر ہندو پاک میں یہ جدید ''مذہبی عقلیت'' متعدد اہل فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قرطاس کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی، جس میں جسٹس امیر علی کا نام بھی اگرچہ بالکل غیر اہم نہیں، تاہم ہر اعتبار سے اہم ترین نام سرسید احمد خان مرحوم کا ہے۔ فکر اسلامی کے اس دور میں ان حضرات کا مقام بالکل وہی ہے جو دورِ قدیم میں اوّلین معتزلہ کا تھا، یعنی مذہب کے نقل کے مقابلے میں عقل کی بالکل دوسری انتہا پر!

سرسید مرحوم کا ملتِ اسلامی کے ساتھ اخلاص تو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے ہی واقعہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے ساتھ مخلصانہ تعلق میں بھی شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ......نماز روزے کے معاملے میں وہ متشدد ''وہابی'' تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ایسا والہانہ تعلق خاطر تھا کہ جب ۶۴-۱۸۵۸ء میں سر ولیم میور کی کتاب ''حیات محمدؐ'' شائع ہوئی، جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر رکیک حملے کئے گئے تھے تو وہ سخت بے چین اور مضطرب ہو گئے اور بقول ان کے ان کا ''جگر خون ہو گیا'' اور انہوں نے لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ ''میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں'' اس کی اشاعت کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی، تم اوّل تو راجہ جے کشن داس سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ میری علی گڑھ والی کوٹھی فروخت کر دو!

...... بایں ہمہ ان پر مغربی علوم و فنون اور خاص طور پر جدید سائنس کا ایسا رعب تھا اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر پر اس قدر غالب آ گیا تھا کہ ان کی عینک سے جب انہوں نے دین و مذہب کا مطالعہ کیا تو اس کی بہت سی چیزیں انہیں ایسی نظر آئیں جن کو ''ماننے'' کے بعد اہل مغرب سے آنکھیں چار کرنا ان کے نزدیک دشوار تھا، چنانچہ دین و مذہب کی خیر خواہی انہیں اسی میں نظر آئی کہ ایسی چیزوں کی حتی الامکان تو عقلی و سائنٹفک توجیہہ کر دی جائے اور جن چیزوں کی توجیہہ کسی طرح ممکن نہ ہو، ان کا انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ ملائکہ محض قوائے طبیعہ (Forces of the Nature) قرار پائے............ جن انسانوں ہی میں سے اجڈ، گنوار اور اور مشتعل مزاج لوگ ٹھہرے، معجزات کی خالص طبعی (Physical) توجیہہ ہوئی۔ جنت کی اور دوزخ کو مقامات (Places) نہیں بلکہ صرف کیفیات (States) قرار دیا گیا۔ مذہبی رواداری کا راگ الاپا گیا۔ اور جہاد کے بارے میں معذرت خواہانہ روش اختیار کی گئی دنیوی ترقی و عروج نظریات و افکار کی صحت کے ثبوت گردانے گئے اور مغربی تہذیب و تمدن اور طرز بود و باش کو مسلمانوں کے جملہ قومی و ملی امراض کا واحد علاج اور ان کے عروج و ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا...... چنانچہ بالکل صاف کہا گیا کہ مذہب کے علاوہ ہر بات میں انگریز بن جاؤ!...... اور نوبت بایں جا رسید کہ خود خدا کا تصور بھی حی و قیوم، سمیع و بصیر، رحیم و کریم، صاحب ارادہ وہ مشیت اور غفور و منتقم ہستی کے بجائے سائنس کے علت العلل [1] (The First Cause) کی صورت

اختیار کر گیا............اور وحی و قرآن کے بارے میں جو تصور اختیار کیا گیا اور ''بے چارے''

واضح رہے کہ علت العلل اور مسبب الاسباب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جبریل امینؑ کو جس طرح بیک بنی دو دو گوش ''رخصت'' کیا گیا وہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

ز جبریل امیں قرآں[1] بہ پیغامے نمی خواہم

ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

[1] اس شعر میں ''معشوق'' کا اطلاق جس طرح آنحضور ﷺ پر بھی ہوسکتا ہے اور خدا پر بھی بالکل اسی طرح کا قول ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسول ﷺ بھی......دونوں جگہوں پر اصل انکار جبریل امین کا ہے......!

گویا ''مذہب'' کی مکمل قلبِ ماہیت ہوگئی اور ہماری اپنی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق مذہب کا خالص ''غیر مذہبی ایڈیشن'' تیار ہوگیا چنانچہ بالکل ٹھیک کہا تھا حضرت اکبر الہ آبادی نے کہ ؎

دیکھ کاریگرئ حضرت سید اے شیخ

دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

ہم نے سرسید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے یہ چند شاہکار اس لیے پیش کر دیئے کہ یہ واضح ہو جائے کہ آج تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں، درحقیقت فکر سرسید ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسید بے چارے تو پھر بھی معذور تھے، اس لیے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی فکر کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی و عسکری قوت بھی بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہین، درآں حالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی ''خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی'' کر چکی، سائنس کی مادہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی، اور مغرب کی سیاسی و عسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی!

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

بہر حال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکر سید کی ہے۔ شخص سرسید تو بہت جلد اپنے رب سے جا ملا لیکن فکر سرسید دراصل تاریخ اسلامی کا ایک دور ہے جو تا حال جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے جو پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا تعلق علی گڑھ سے وہی ہے، جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاک و ہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری طور پر اسی مکتبۂ فکر سے متعلق و منسلک ہیں جس کی ابتدا سرسید مرحوم نے کی تھی۔

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دماغ کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ و قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا اور اس قول میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ دارالعلوم ہی کا تحفظ کیا اور اس قول میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ کا مؤثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ ہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف اُن کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس و میلاد اور فاتحہ و درود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق و منسلک ہیں۔

تحریکِ دیو بند کی ان مختلف شاخوں کے مابین مجموعی مزاج اور دائرہ ہائے کار کا فرق و امتیاز بھی ایک دلچسپ علمی موضوع ہے۔ ان میں اصل عوامی عناصر جو مذہب و سیاست دونوں کا مظہر یا بالفظ دیگر مذہبی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار ہے ذہناً وقلباً ''حسینی'' ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنی سے ذہنی تعلق اور قلبی ارادت وعقیدت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام بھی درحقیقت اسی کا تتمہ یا صحیح تر الفاظ میں ضمیمہ ہے۔ تھانوی اور عثمانی حلقے علمی ذوق اور متصوفانہ مزاج کے حامل ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا یوسف بنوری کا مزاج خالص علمی ہے...... اور تبلیغی جماعت خالص غیر سیاسی وغیر علمی لیکن نہایت پر جوش وفعال مذہبیت کا مظہر ہے...... ان تمام امتیازات کے علی الرغم جہاں تک مذہبی فکر کا تعلق ہے وہ ان سب میں مشترک ہے۔ مذہب کے نقل کے یہ سب ایک سے فدائی ہیں اور قال اللہ وقال الرسول ﷺ ہی نہیں اسکی بھی ایک متعین صوت یعنی مسلکِ حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن وسنت کا معروضی (Objective) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامر ونواہی کے اسرار وحکم کو سمجھنے کی کوشش کرے اور سب سے بڑا علمی مشغلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری وماتریدی عقائد اور فقہ حنفی کے لیے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کئے جائیں...... دوسرے طرف جدید علوم وفنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبیعات' کیمیا' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ پچھلی دو تین صدیوں میں فراہم کیا ہے اس کے بارے مین ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ ومنطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہِ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلا واسطہ علم انہیں حاصل نہیں...... گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی وفکری اعتبار سے خالصتہً آج سے سات آٹھ سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں سے کچھ حضرات اپنی تحریر وتقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہِ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسد ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحر محیط میں دو روئیں بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیحدہ علیحدہ بعینہٖ اسی کیفیت کے ساتھ چلی جا رہی ہیں جس کا نقشہ سورۃ الرحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○

''چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے (بھی) ہیں (اور) ان کے مابین ایک حجاب (بھی) ہے (جس سے) تجاوز نہیں کر سکتے۔''

ان دو متضاد فکری وتہذیبی سوستوں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم میں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیو بند کا پوری ملت دو نمایاں طور پر مختلف مکاتب فکر ونقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک مضر اور مایوس کن...... ایک جانب جدید علوم وفنون اور سائنس وٹیکنالوجی ہے لیکن ملحدانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان واسلام ہے لیکن جمودِ مطلق اور فرسودہ واز کار رفتہ فلسفہ ومنطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتبِ فکر کو علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے...... اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تاحال ان کے مابین امتزاج میں کوئی مؤثر صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر وبیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرج دار تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملت اسلامیہ کی اس وقت کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ اس ''آویزش'' میں کسی واقعی وحقیقی ''آمیزش'' کا رنگ تاحال پیدا نہیں کیا جا سکا۔